شاہی دور کی لکھنوی تہذیب کی فکری بنیادیں

ڈاکٹر ظفر حسین ہرل

Abstract:

Lukhnow has been cradle of civilization for centuries. This civilization has its distinct features. These features have their roots in ideology of the people of territory. The cultural identity of Lukhnow has been developed since the ages long ago the Muslim era. The present research briefly but logically discuses all those historical fact that take part to develop these features of the culture. The feminine sensibility, richness and sophistication of culture and the tradition of storytelling are salient feature of Shahi epoch. The whole complex nature of the fabric of Shahi epoch has the roots in the ancient history, geographical feature and the governing dynasties of Awadh. The profound analysis of social, intellectual and cultural development in Hindu, Budh and Muslim era reveal this ideological basis of Shahi epoch.

اردو ادب میں دو ادبی دبستان جو کہ دہلی اور لکھنؤ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں، اپنی انفرادی ادبی خصوصیات منوا چکے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کا مزاج دہلی سے مختلف نہیں ہے بلکہ یہ اس کی ہی توسیع صورت ہے جس میں وقت کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ پر بے شک اہم ہے لیکن آج ہم لکھنؤ کو ادب اور خاص طور پر شاعری میں الگ دبستان کے حوالے سے ہی جانتے ہیں۔ ان خصوصیات کا تعارف جن کی وجہ سے دبستان لکھنؤ الگ شناخت کا حامل ہے، بات کو طول دینے کے مترادف ہے لیکن کن وجوہات کی بنیاد پر لکھنوی تہذیب کا سب سا بڑا مظہر 'دبستان لکھنؤ' اپنی بنیادی صفات کی وجہ سے الگ اور منفرد ہے، ان وجوہات اور بنیادی تہذیبی وجوہات کا جاننا زیادہ دلچسپ اور اہم ہے۔ شہر لکھنؤ جو خطہ اودھ کا سیاسی مرکز رہا ہے اس کا سماجی ارتقاء دہلی سے مختلف مذہبی، معاشی، تاریخی اور جغرافیائی عوامل کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ محرک ہے جس کی وجہ سے 'دبستان لکھنؤ' کی

الگ پہچان بنی ہے۔

تہذیب سے مراد ایسی معاشرتی ترتیب ہے جو کسی معاشرے میں ثقافت کی تخلیق کو فروغ دیتی ہے۔بنیادی طور پر چار عناصر ایسے ہیں جو تہذیب کی شکل بنانے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

ا۔معاشی بہم رسانی ب۔سیاسی تنظیم ج۔اخلاقی روایات د۔علم وفن کی جستجو

ماہرین سماجیات کے نزدیک کلچر اور تہذیب قریب قریب ہم معنی بھی ہیں لیکن ان میں جو باریک فرق نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ تہذیبوں کی بنیاد میں ثقافت کا عنصر شامل ہوتا ہے اس لیے کہ تہذیب کلچر کے بعد کا عمل ہے جیسے ول ڈیورانٹ نے کہا ہے کہ کلچر زراعت کی پیداوار ہے(۱)۔ان عناصر کے علاوہ جغرافیائی حالات بھی تہذیب کو متشکل کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔جغرافیائی حالات سے مراد سالانہ موسموں، درجہ حرارت اور بارشوں کی تبدیلی وغیرہ ہے۔جسمانی یا حیاتیاتی حالات تہذیب کو متشکل نہیں کرتے بلکہ بعض باریک نفسیاتی عوامل ایسے ہوتے ہیں جو زبان، ضابطہ اخلاق اور تعلیمی نظام اور کلچر کے ساتھ مل کر تہذیب کو بنیادی خدوخال عطاء کرتے ہیں(۲)۔یہ تہذیبی اور ثقافتی نظام روایات، علم، مادی اشیا اور قوموں کے مجموعی مزاج پر مشتمل ہوتا ہے اس میں خیالات، اقدار، رواج اور روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بھی شامل ہوتی ہیں۔کلچر زمانہ قدیم کی تاریخ سے لے کر آج تک کے تمام انسانی تجربات پر مشتمل ہوتا ہے۔ڈاکٹر سید عبدالباری کے مطابق:

> ''کلچر یا ثقافت دراصل جوہری اعتبار سے اس طریق فکر، اس نظریہ حیات، اور اس معیار امتیاز و انتخاب کا نام ہے جو انسانوں کی کسی معتدبہ جماعت کے دل اور دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور جس کے زیر اثر وہ جماعت دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقہ کو اختیار کرتی ہے۔اور تمدن اسی خاص طرز زندگی کا نام ہے جو اس تہذیب کے زیر اثر اختیار کیا جاتا ہے۔''(۳)

ثقافت کے بڑے اور اہم عناصر چار ہیں، ا۔زبان ب۔رسم ورواج ج۔ممنوعات د۔اقدار

زبان، رسم و رواج، ممنوعات اور اقدار چاروں عناصر ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مجموعی ثقافتی صورت حال کو بھی متاثر کرتے ہیں اور مجموعی معاشرتی صورت حال سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔کسی تہذیب میں اس کی ثقافت جامد نہیں ہوتی بلکہ نامیاتی مزاج رکھتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اچھی یا بری تبدیلی ہوتی رہتی ہے(۴)۔ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق تہذیب اور ثقافت دونوں کے مفاہیم کو ملا کر کلچر کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ان کے خیال کے مطابق تہذیب کسی معاشرے کی ایسی چیزوں سے تعلق رکھتی ہے جو ظاہر میں موجود ہیں اور ثقافت کا تعلق ان چیزوں سے ہے جن کا تعلق کسی معاشرے کے افراد کے ذہن سے ہے(۵)۔

برصغیر جو اپنی وسعت کے اعتبار سے کسی براعظم سے کم نہیں، جغرافیائی لحاظ سے باقی دنیا سے الگ تھلگ ہے۔اس میں دنیا کے مشہور ترین زرخیز دریائی میدانوں میں سے ایک میدان سندھ گنگا میدان Indo-gangetic plain واقع ہے۔اس میدان کے مرکز میں گنگا اور ہمالیہ کے درمیان اودھ کا مشہور زرخیز

اور شاداب خطہ واقع ہے۔شمالی ہند میں اودھ کا خطہ اپنی زرخیزی کے سبب ہمیشہ جنگجو قوموں کو اپنی طرف بلانے کا سبب بنا(۶)۔ جب آریاؤں نے برصغیر میں اپنے قدم جمائے تو وادیٔ سندھ سے آگے بڑھتے ہوئے وہ یہاں تک آئے۔انہوں نے اس زرخیز اور صحت افزاء خطے کو پسند کیا اور اس کا نام 'آریہ ورت' (آریوں کی سرزمین) رکھا اور دریائے گھاگھرا کے کنارے ہستناپور کے نام سے اس کا صدر مقام بنایا(۷)۔اس علاقے میں مشہور ہندو کردار رام چندر پیدا ہوا تھا۔رام چندر قدیم چندر بنسی خاندان کا عظیم راجا اور راجہ دسراتھ (Dasharatha) کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ہندوستان کی قدیم جنگ کوروں اور پانڈو کی لڑائی مہا بھارت بھی اسی علاقہ میں ہوئی جو ریاست کوسالہ کی حاکمیت کی لیے لڑی گئی تھی(۸)۔والمیک نے سنسکرت میں عظیم رزمیہ نظم رامائن اسی رام چندر کے کارناموں پر لکھی تھی(۹)۔اجودھیا میں دریائے گومتی کے جنوبی کنارے پر رام چندر کے بھائی لکشمن نے لکھنؤ کی بنیاد رکھی اور جگہ لکشمن ٹیلہ یا لکشمن پور کہلائی جس کے بارے میں مختلف روایات ہیں لیکن تاریخ فرشتہ کے حوالے سے علامہ سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ تاریخ میں لکھنؤ کے نام سب سے پہلے ۸۰۳ھ میں ملتا ہے(۱۰)۔اجودھیا سے ہی اس علاقہ کا قدیم نام اودھ بنا ہے اور برصغیر میں یورپی اقوام کی آمد کے ساتھ ہی اجودھیا کا نام اودھ ہوا(۱۱)۔

بدھ مذہب کی تاریخی روایات کے مطابق چھٹی صدی قبل مسیح میں شمالی ہند کا یہ علاقہ دو مشہور ہندو ریاستوں مگدھا (Magadha) اور کوسالہ (Kosala) میں تقسیم تھا۔دریائے گنگا کے شمال طرف مگدھا سے تھوڑا مغرب کی طرف ریاست کوسالہ واقع تھی۔کوسالہ کا صدر مقام سری واستو تھا جس کے مشرق میں ہمالیہ کی ترائی کے ساتھ شاکیہ (Sakya) قبیلہ رہتا تھا۔اسی قبیلہ کا مشہور فرد گوتم سدھارتھ (Sakyamuni) کپل واستو (Kapilvastu) میں ۵۶۳ق م میں پیدا ہوا جس کو دنیا ایک عظیم مذہبی فلسفی کی حیثیت سے جانتی ہے(۱۲)۔

تیسری صدی قبل مسیح میں یہ سارا علاقہ چندر گپت موریہ کے زیر تسلط تھا اس کی سلطنت کا صدر مقام پاٹلی پترا تھا چندر گپت موریہ کے بیٹے اشوک نے اپنے دور میں بدھ فلسفہ کی ترویج کے لیے شاندار خدمات سرانجام دیں (۱۳)۔بعد میں ہمالیہ کی ترائی سے بھیل، پاسی اور دوسرے قبائل اس علاقہ پر حاوی ہوتے گئے۔اس دور میں سارا ہندوستان چھوٹی چھوٹی آزاد اور خودمختار ریاستوں پر مشتمل تھا۔ جب ۱۱۹۳ء میں سلطان محمد غوری دہلی کو فتح کیا تو شمالی ہندوستان میں مسلم دور شروع ہوا۔جلال الدین اکبر نے لکھنؤ میں چوک اور کئی محلے تعمیر کروائے۔اورنگ زیب عالمگیر نے لکھنؤ کا دورہ کیا اور مشہور لکشمن ٹیلے پر مسجد تعمیر کروائی۔اس نے شہر میں موجود گھوڑوں کے فرانسیسی تاجر کی جائیداد جو چار خوبصورت عمارتوں کا مجموعہ تھی، بحق سرکار ضبط کر کے ملا نظام الدین سہالوی کے حوالے کی یہی عمارت بعد میں فرنگی محل کے نام سے مشہور ہوئی اور اس میں ملا نظام الدین سہالوی نے مدرسہ قائم کیا، روایت کے مطابق درسِ نظامی کا نصاب جو آج تک سنی مدارس میں طلباء کو پڑھایا جاتا ہے اسی ملا نظام الدین سہالوی کا تجویز کردہ ہے۔ ملا نظام الدین کی اولاد چونکہ اس محل میں قیام پذیر رہیں جو فرانسیسی تاجر سے اورنگ زیب عالمگیر نے بحق سرکار ضبط کیے تھے۔اس لئے وہ محل، فرنگی محل اور ملا نظام الدین سہالوی کی اولاد علمائے فرنگی محل کہلاتے تھے(۱۴)۔

مغل شہنشاہ دہلی محمد شاہ نے ایک ایرانی امیر نواب محمد امین سعادت خان برہان الملک نیشاپوری کو ۱۷۲۲ء

میں اس صوبہ اودھ کی صوبہ داری پر متعین کیا ۔ جب صوبہ داری تبدیل ہوئی تو برہان الملک نے لکھنؤ کی بجائے فیض آباد کو اپنا صوبائی دارالحکومت بنایا ۔فیض آباد میں نواب نے اپنی رہائش کے لیے کچی گڑھی یا بنگلہ تعمیر کیا جس کو عام طور پر بنگلہ کا نام سے یاد کیا جاتا تھا ۔قیوم نظر نے لکھا ہے:

> ''برہان الملک سپاہی پیشہ آدمی تھے ۔انھوں نے آبادی سے دور دریا گھاگھرا کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر اپنا خیمہ نصب کیا ۔برسات میں تکلیف کے پیش نظر ایک مناسب مقام پر چھپر ڈلوایا تھا۔برہان الملک کی وفات کے بعد اودھ کی صوبہ داری پر ان کا داماد صفدر جنگ متعین ہوا اور تاریخ فرح بخش اور دوسرے حوالوں کے مطابق اس بنگلے کا نام صفدر جنگ ہی کے عہد میں فیض آباد مشہور ہوگیا تھا۔''(۵)

اودھ کی تاریخ میں شجاع الدولہ کا دور سیاسی طور پر بہت اہم ہے۔اس دور میں مغل کمزور ہو رہے تھے جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی طاقت مضبوط کر رہی تھی ۔صفدر جنگ کے اودھ کے صوبیدار بننے کے ساتھ ہی یہ تصور مضبوط ہوگیا تھا کہ اب اودھ کی صوبہ داری وراثتی حکومت کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ میں شاہ عالم اور میر قاسم تینوں کی مجموعی فوجوں کا سپہ سالار شجاع الدولہ تھا۔شجاع الدولہ اپنے ہی نائب راجہ بینی بہادر کی غداری کی وجہ سے یہ جنگ ہار گیا(۱۶) ۔شجاع الدولہ اور شاہ عالم ثانی کی مشترکہ فوجوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں شکست نے لکھنوی مزاج میں موجود سہل پسندی کو تقویت دی جس کی وجہ سے مزاحمت کے عنصر کو ختم کر دیا(۱۷) ۔سریندرا موہن کے خیال کے مطابق برصغیر کی تاریخ میں جنگ پلاسی کے نسبت جنگ بکسر کی اہمیت زیادہ ہے۔اس جنگ میں ہندوستان کی تین اہم طاقتیں آمنے سامنے آئیں ،مغل اور مقامی نوابین ایک طرف اور ایسٹ انڈیا کمپنی دوسری طرف تھی (۱۸) ۔

۱۷۷۵ء میں شجاع الدولہ کی وفات کے بعد اس کے سب سے بڑے بیٹے آصف الدولہ نے صوبہ اودھ کی گدی سنبھالی ۔آصف الدولہ نے اپنی ماں کے اثر سے بچنے کے لیے فوری طور پر فیض آباد سے لکھنؤ اپنا صدر مقام میں منتقل کر لیا۔اس طرح اودھ میں ایک طرح کی موروثی ریاست کی بنیاد پڑی۔وقت کے ساتھ ساتھ اودھ کا دہلی سے تعلق کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا اور اودھ سے انگریزوں کا سیاسی تعلق بڑھتا گیا آخر ۱۹ / اکتوبر ۱۸۲۰ء کو جب غازی الدین حیدر کو اودھ کا خودمختار بادشاہ بنایا گیا تو دلی کے ساتھ اودھ کا رہا سہا تعلق بھی ختم ہوگیا ۔صوبہ اودھ ایک خاندانی ریاست میں تبدیل ہوا جس کا مرکز لکھنؤ تھا(۱۹) ۔امجد علی خان نے لکھا ہے:

> ''جب انگریزوں نے زور زبردستی اور سخت رویہ اختیار کر کے نواب غازی الدین حیدر سے ڈھائی کروڑ روپے وصول کر لئے ۔تب گورنر جنرل نے ایک ایسا تیر پھینکا جس سے دو شکار ہوئے ۔یعنی ایک طرف نواب اودھ کو شہ دی کہ وہ بادشاہ کا لقب اختیار کریں ۔دوسری طرف انگریزوں نے اودھ میں بادشاہت کا ڈھونگ اس لئے رچایا کہ دلی کے شہنشاہ کی جو ساکھ باقی رہ گئی اس کی اہمیت کم ہوجائے (۲۰) ۔''

غازی الدین حیدر ۱۸۱۹ء سے ۱۸۲۷ء تک اودھ کا بادشاہ رہا۔ ۱۸۲۷ء میں نصیرالدین حیدر کو اودھ کا بادشاہ بنا۔ ۱۸۴۲ء میں محمد علی شاہ کی وفات پر امجد علی شاہ تخت نشین ہوا۔ تاریخ اودھ کا سب سے مشہور بادشاہ واجد علی شاہ ۲۵ سال کی عمر میں ۱۸۴۷ء میں اودھ کا بادشاہ بنا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اودھ کے ساتھ انگریزی کی پالیسی سخت سے سخت ہوتی گئی۔ جب تک ہندوستان کی باقی ریاستوں کو فتح کرنے کیلئے ان کو رقم اور فوج کی ضرورت رہی اور جب تک وہ اس قابل نہیں تھے کہ وہ مکمل طور پر ہندوستان پر قبضہ جمالیں وہ اودھ کے شاہوں کو رعایت دیتے رہے۔ اودھ اور حیدرآباد دکن دو ایسی دیسی ریاستیں رہ گئی تھیں جو قابل ذکر تھیں اور جن سے کمپنی کو کوئی خطرہ ہو سکتا تھا۔ سو انہوں اودھ کو ختم کر کے مما لک محروسہ میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر کار ۷ فروری ۱۸۵۶ء کو واجد علی شاہ جان عالم پیا کو لکھنؤ کے تخت سے اتار دیا گیا اور ریاست پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہو گیا (۲۱)۔ سقوط لکھنؤ کے بعد وہاں انگریزوں کی طرف سے چیف کمشنر مقرر ہوا جس نے لکھنؤ کی تاریخی عمارات اور محلوں کو گرا کر لکھنؤ شہر کا پرانا رنگ روپ ختم کر دیا۔ سقوط اودھ کے بعد برطانیہ کی پارلیمنٹ میں جو الزامات اودھ کی سلطنت کے خلاف لگائے گئے تھے وہ تاریخ میں بلیو بک (Blue Book) کے نام سے جانے جاتے ہیں (۲۲)۔ ان الزامات کا جواب بھی دیا گیا لیکن تب تک واجد علی شاہ مٹیا برج کلکتہ میں اسیر ہو چکے تھے اور والدہ واجد علی شاہ نے یہ جوابات لندن میں ملکہ برطانیہ تک پہنچائے بھی، لیکن ان کی شنوائی نہ ہو سکی اور سلطنت اودھ اور برہانی خاندان کی حکومت قصہ پارینہ بن گئی۔

اودھ میں خاندان برہان الملک کی نوابی اور شاہی تقریباً سوا سو سال رہی یہ عرصہ زیادہ تر امن اور سکون کا عرصہ رہا ہے۔ سوائے چند ابتدائی سالوں کے پورا عرصہ اور خاص طور پر نواب آصف الدولہ کے لکھنؤ میں منتقل ہونے کے بعد کا زمانہ مکمل طور پر امن کا زمانہ رہا ہے۔ اس دور میں لکھنؤ میں خوشحالی آئی اور پورے ہندوستان اور ایران سے لوگ یہاں ہجرت کر کے آتے رہے، یہ لوگ یہاں کے باسی بن کر رہ گئے جنہوں نے یہاں کی تہذیب کے انفرادی رنگ ابھارنے میں اپنا کردار ادا کیا۔

> ''اودھ کی نوابی اور بادشاہی کم بیش سوا سو سال رہی اور آہستہ آہستہ لکھنؤ تہذیب و تمدن، فنون و ثقافت اور شعر و ادب کا مرکز بن گیا۔ ملک اور بیرون ملک سے صاحبان علم و فضل اور قسمت آزما کھنچ کھنچ کر یہاں آئے۔ ایران سے آنے والوں کا خاص طور پر تانتا بندھ گیا۔ وہ لوگ یہیں کے باسی ہو گئے۔ اس لئے لکھنؤ کی تہذیب و افکار پر ایرانی اثرات صاف نظر آتے ہیں۔'' (۲۳)

سعادت خان کے جانشین نواب آصف الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ تک کا زمانہ لکھنؤ میں سیاسی طور پر امن کا زمانہ تھا۔ اودھ کا دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد لکھنؤ کے سماجی اور تہذیبی حالات تیزی سے تبدیل ہونے لگے تھے۔ دلی جو نہ صرف ہندوستان کا سیاسی صدر مقام تھا بلکہ ہند مسلم تہذیب کا مرکز بھی تھا، بدنظمی اور خلفشار کا شکار ہو چکا تھا، سیاسی اور معاشی طور پر کمزور دلی سے اہل کمال نے آہستہ آہستہ لکھنؤ کا رخ کرنا شروع

کیا(۲۴)، شرر نے بھی دلی سے اودھ کی طرف انتقال آبادی کے بارے میں ذکر کیا ہے(۲۵) جس سے لکھنؤ میں ایک ایسی ہند اسلامی تہذیب پنپنا شروع ہوئی جس کے اہم اور بنیادی عناصر دلی میں تشکیل پا چکے تھے۔ لکھنؤ میں خوبصورت اور جدید عمارتیں بننے لگیں، لباس، سواری اور کھانے پینے میں نت نئی جدتیں آنے لگیں۔ شاعری اور ادب کا رنگ داخلی کے بجائے خارجی ہوگیا، نمود و نمائش اور ظاہر داری تہذیب و شرافت کا نمایاں عنصر بنتی گئی۔ دربار اور اس سے منسلک امراء اور جاگیرداروں کا ادارہ مضبوط ہوا اور ان کی بدولت نئی اقدار اور روایات تشکیل پانے لگیں۔ اودھ کے جغرافیائی حالات، زرخیز زمینیں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک آبادی اور مذہبی آزادی و رواداری، شاہان اودھ کی مذہبی وابستگیاں، قدیم ہندو استھان اور بدھ مذہب کے پوجا کے مراکز کی موجودگی، جاگیردارانہ نظام، تعلقہ داری اور امن عامہ و معاشی خوش حالی لکھنؤ کا سماجی اور تہذیبی ڈھانچہ تشکیل دے رہے تھے۔ آبادی کا بڑا حصہ غیر مسلم باشندوں پر مشتمل تھا جن میں راجپوت، برہمن، ویش، کائیستھ اور شودر بھی تھے۔ امریش مشرا کے مطابق لکھنؤ کے مغرب میں ہندو برہمنوں کا قدیم مرکز قنوج اور قنوج کے شمال مغرب میں اودھ واقع تھا۔ اس طرح اودھ میں ایک بڑی تعداد ہندوؤں کی تھی(۲۶)۔ اگرچہ اودھ کے شاہان کا تعلق ایران سے تھا اور شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے لیکن لکھنؤ میں مسلم آبادی کا بڑا حصہ سنّی مسلک سے بھی تعلق رکھتا تھا، علمائے فرنگی محل سنّی مسلک کے بہت بڑے مبلغ اور عالم تھے اور ان میں اکثر قاضی عدالت کے عہدوں پر بھی رہے(۲۷)۔

یہی زمانہ اودھ اور لکھنؤ کی تہذیبی اور ثقافتی ترقی کا دور ہے جس میں لکھنؤ میں ایک منفرد اور نفاست سے بھرپور جاگیردارانہ شہری تہذیب پروان چڑھی۔ لیکن یہ جاگیردارانہ سماج اپنے اندر صحت مندانہ فکری رویے کی نمو کی کمی کے سبب لکھنوی معاشرے میں روایت پرستی، عقیدہ پرستی، توہم کا پرچار، تقدیر پرستی اور کئی ایک لایعنی مشاغل کو بھی فروغ دینے لگا تھا۔ معاشرے کی داخلی بے چینی اور نا آسودگی مختلف رنگوں میں نمایاں ہونا شروع ہوئی۔ زندگی کا کوئی بڑا مقصد نہ تھا، پورا لکھنوی سماج داخلی سکون کی خاطر نشاط پرستی کی طرف مائل ہوگیا۔ چونکہ نشاط کی بنیادی اور اہم ضرورت عورت تھی اس لئے لکھنؤ کا پورا تہذیبی ڈھانچہ طوائف کے ادارے کی ترقی کی بنیاد بنا۔ جاگیردار، طوائف اور ظاہر داری لازم و ملزوم ہیں اس لیے یہی کچھ لکھنؤ کی تہذیب میں نمایاں ہوتا گیا۔ اس حقیقت کو ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے یوں لکھا ہے:

> ''ایک نا آسودہ سماج جس کی صلاحیتیں غیر ملکی سامراج کی مداخلت کے باعث فطری اظہار کے حقیقی مواقع نہ پا کر اس طرح بے راہ رو ہو جاتی ہیں کہ صحت مند سماج کی تعمیر کی بجائے عیش امروز سے نشاط کا آخری قطرہ نچوڑ لینے کی خواہش زندگی کا مقصد بن جاتی ہے اور لطافتوں کی تلاش اسے اس طرح کثافتوں کے دائرے میں اسیر کر دیتی ہے کہ ہر عیب ہنر بن جاتا ہے اور مصنوعی طریقوں سے قوت اور لذت حاصل کرنے کی آرزو طوائف کے ادارے کو سماج کی ایک ناگزیر حقیقت بنا دیتی ہے(۲۸)۔''

طوائف اور اس کا ادارہ لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کا بنیادی عنصر بن گیا اور وہ ادب، شاعری اور موسیقی کے ساتھ

ساتھ لکھنؤ کی مذہبی رسومات میں بھی نمایاں نظر آنے لگی۔ معاشرے میں فکری اظہار کے مناسب اسباب میسر نہ آنے کے سبب اس کے افراد کی اپنی مجہولیت نسائیت کے مختلف روپ مثلاً خودستائشی، خوشامد پسندی اور بے جا نفاست کی شکلیں اختیار کرنے لگی جس کی وجہ سے ایسے مشاغل فروغ پاتے گئے جن میں حصہ لینے والوں کی شمولیت انفعالی ہوتی تھی، جس کی نمایاں مثال بٹیر بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی، قصہ خوانی، رقص وسرود کی محافل، جانوروں کی لڑائی اور مرغوں کی لڑائی وغیرہ ہے۔ لکھنؤ کے بانکے تھے جو چاہنے سے زیادہ چاہے جانے والی ادائیں رکھتے تھے۔ ریختی، جو لکھنوی ادب کا بنیادی عنصر ہے، اردو شاعری کی ایسی صنف ہے جس کی مثال عالمی ادب میں ملنا مشکل ہے۔ یہ صنف ادب اپنی طرز کی واحد مثال ہے جو لکھنؤ میں ہی شروع ہوئی اور وہیں پر کمال کو پہنچی، اس میں عورتوں کی زبان اور محاورے میں نسائی احساسات وجذبات کو شاعرانہ جمالیات کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا(۲۹)۔

دربار دار اور دربار سے وابستہ امراء اپنے جاہ وحشم کے اظہار کے نت نئے طریقے نکالتے رہتے تھے جو لکھنوی تہذیب کے نمائندہ رسوم ورواج کہلاتے تھے۔ اودھ کا نوابی اور بادشاہی دور کم وبیش سوا سو سال (۱۷۲۲ء تا ۱۸۵۶ء) رہا اور آہستہ آہستہ لکھنؤ ہند اسلامی تہذیب وتمدن، فنون وثقافت اور شعر وادب کا مرکز بن گیا۔ اس دوران ہندوستان کے علاوہ خاصی تعداد میں ایران سے بھی صاحبان علم وفن اور طالع آزما یہاں آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی اس لئے لکھنؤ کی تہذیب وافکار پر ایرانی اثرات بھی پڑے۔ ظاہر داری اور ملمع کاری تہذیب کے بنیادی عناصر بن گئے تھے۔ معتدل آب وہوا اور زرخیز زمینوں نے بھی یہاں کی تمدنی زندگی پر بھی بڑا خوشگوار اثر ڈالا ہے(۳۰)۔

لکھنؤ کا تمدن قدیم تہذیبی اثرات، مقامی، نفسیاتی اور معاشی وجوہات کی وجہ سے اپنی ثقافت کا الگ رنگ دکھانے لگا۔ لکھنؤ گوشہ امن تھا جہاں تھوڑی سی محنت کے ساتھ زندگی کی راحتیں میسر تھیں یہاں کے جغرافیائی حالات نے بھی اپنا اثر دکھایا اور یہاں کی معاشرت، زبان اور لباس میں لفظریبی پیدا ہوتی گئی۔ لکھنؤ کی معاشی فراغت نے دولت مندوں اور بے فکروں کی بڑی جماعت پیدا کردی جن کے پاس کوئی بڑا مقصد زندگی نہ تھا انگریز لکھنؤ کی سیاست اور فوج پر چھائے ہوئے تھے۔ فوجی سرگرمیاں بند تھیں لہٰذا عوام کا بڑا حصہ وقت کو اچھے طریقے سے گزارنے کے لیے عیش پرستی، راگ رنگ، میلوں ٹھیلوں اور جانوروں کی لڑائیوں میں مصروف تھا۔ ایک ایسا معاشرہ ترتیب پانے لگا جس میں لذت دنیا زیادہ تھی۔ شاہی دور کی یہ صورت حال جب یہ اودھ کی مقامی روایات کے ساتھ مدغم ہوئی تو لکھنؤ کے تہذیبی مزاج کا اپنے منفرد عناصر عام معاشرتی رویوں میں راہ پانے لگے۔ یہ حالات تقریباً سو سال تک اودھ کی ریاست میں قائم رہے اس طرح تہذیبی نشوونما کے لے جس تسلسل کی ضرورت تھی وہ لکھنؤ کو میسر آ گیا۔ تہذیبی اور ثقافتی ترقی کی یہ روایات برسر اقتدار شاہی خاندان کی سرپرستی میں آگے بڑھتی رہیں اور لکھنؤ کی تمدنی ترقی میں دور شجاع الدولہ سے لے کر واجد علی شان تک ایک ہی انداز فکر غالب رہا جس کے نتیجے میں تسلسل کے ساتھ مخصوص عناصر کو لیے ہوئے لکھنؤ کی تہذیبی ترقی جاری رہی۔

لکھنؤ کی اس تہذیبی ترقی میں یہاں کی قدیم ہندو روایات کا بھی گہرا اثر ہے۔ اودھ زمانہ قدیم سے ہندو

روایات کا امین چلا آ رہا ہے فیض

آباد صرف چند کلومیٹر سے دور رام چندر جی کی حکومت کا قدیم صدر مقام اجودھیا واقع تھا۔ آلہ آباد دریائے گنگا اور جمنا کے سنگم پر واقع ہے جہاں ہر بارہ سال بعد ہندوں کا مشہور کنبھ کا میلا ہوتا ہے، اودھ کے اسی علاقے میں واقع تھا۔ بنارس کا عظیم شہر بھی صوبہ اودھ میں ہی تھا۔ ان قدیم مراکز کی وجہ سے ہندو روایات اس علاقے کے لوگوں کو ورثے میں ملی تھیں۔ ہندو روایات میں حسن پرستی اور رومان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ انہی روایات، جو زمانہ قدیم سے اودھ میں میں نشو نما پا رہی تھیں، کے تہذیبی عناصر کا لکھنؤ کے برہانی خاندان کی ایرانی روایات میں سرایت کر جانا فطری امر تھا۔ ہندو فلسفے میں حسن و عشق کا ایک خاص تصور پایا جاتا ہے۔ سولہویں صدی کی ہندو شاعرہ میرا بائی کے دیوان کے دیباچے میں اس امر پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر صفدر آہ لکھتے ہیں:

> ''ہندو فلسفے میں عورت عاشق اور مرد معشوق ہے۔ ہندی شعر و ادب میں عام طور پر اسی اصول کی پابندی کی گئی ہے۔ اس تصور کے تحت وشنوؤں (بھگتی تحریک کا بانی ایک ہندو فرقہ) کے ہاں بھی یہ اصول وضع کیا گیا ہے کہ خالص محبت کی جگہ صرف عورت کا دل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا کرشن کے تمام محبت کرنے والے گوپیوں کی طرح استری (عورت) ہیں۔ پرش (مرد) صرف کرشن ہیں۔ میرا بائی جب برندا بن پہنچیں تو چتوڑ کی راج بہو کے علاوہ بھگت اور شاعرہ کی حیثیت سے بھی ان کی کافی شہرت ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود جیو گوسائیں نے عورت ہونے کی وجہ سے میرا سے ملنا قبول نہ کیا۔ اس پر میرا نے ان کو پیغام بھیجا کہ میں تو سمجھتی تھی کہ برندا بن میں پرش صرف کرشن ہیں، باقی گوپیاں اور استری ہیں۔ یہ تو آج معلوم ہوا کہ برندا بن میں کرشن کے علاوہ بھی پرش رہتے ہیں۔ جیو گوسائیں اس اصولی جواب پر کافی شرمندہ ہوئے اور خود میرا کے پاس پہنچ گئے۔''(۳۱)

درج بالا بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ مقامی صورت حال نظر آتی ہے جس نے لکھنؤ کے ایرانی مزاج نوابوں میں حسن و عشق کے متعلق ایک نیا رنگ پیدا کیا ہو گا اور لکھنؤ کے شاہی خاندان، جو خود بھی عیش پسندی کا میلان رکھتا تھا، نے ان قدیم روایات میں نئے نئے اضافے کیے ہوں گے جو عہد واجد علی شاہ میں اپنی بہار دکھانے لگے۔ ایسی روایات رفتہ رفتہ لکھنؤ کے معمولات میں داخل ہوئی گئیں جنھوں نے عوام کے احساس جمال اور تحریک عشق کو اور زیادہ تیز کر دیا۔ امرا کو جذبہ عیش کوشی اور عوام کو تماش بینی کی صورت میں اپنے جذبات کی تسکین کا سامان ملتا گیا اور نئے نئے ادارے استحکام پانے لگے۔ اودھ میں معاشی فراغت، خوشحالی، امن اور تمدنی فروغ تھا تو طوائف کے ادارے کو بھی بڑھاوا ملا۔ کسی خاص معاشرے میں مردوں کا طرز زندگی کا اثر عورتوں کے حالات پر بھی پڑتا ہے۔ لکھنؤ میں دولت عورت کے طفیل ملنے لگی تھی اور بازاری عورتوں کا مقام ملکہ تک پہنچ گیا تو عورت ہی اس معاشرے میں ترقی کی سیڑھی قرار پائی۔ لکھنؤ میں ذہین، صاحب علم و فن، شریف اور متمول لوگ طوائف سے ربط و ضبط کو اپنی شان سمجھنے لگے۔ طوائف کے وجود سے لکھنؤ زندہ رہا لیکن اودھ آہستہ آہستہ دم توڑتا گیا۔ طوائف کی کی

صورت میں قدیم ہند و روایات رقص، موسیقی اور ساز بھی زندہ رہا۔ نوابین اودھ نے اس فن کو دربار کی سطح پر سرپرستی دی اور لکھنؤ نے رقص، موسیقی اور ساز کے ایسے ماہر پیدا لیے جنھوں نے اپنے اپنے میدان میں نام کمایا۔

معاشی فراغت اور ہندوانی مقامی اثرات کے بعد یہاں کی تہذیبی خصوصیت کا اہم عنصر لکھنؤ کے شاہی خاندان کے اعتقادت تھے۔ یہ ہانی خاندان شیعہ عقائد کا پیروکار تھا۔ شاہی خاندان کے ساتھ ایرانی امرا و علما لکھنؤ میں بسنے لگے تو ان کے ساتھ شیعہ مذہبی رسم و رواج یہاں پھیلنا شروع ہوئے۔ لکھنؤ کے ایک مولانا مولوی دلدار علی کو باقاعدہ وظیفہ دے کر عراق بھیجا گیا۔ جس نے واپسی پر لکھنؤ میں باقاعدہ امام باڑے قائم کروائے اور شیعوں کے لیے الگ نماز پنجگانہ کے لیے جماعت کا انتظام ہوا۔ لکھنؤ نے ایران سے رشتہ جوڑ کر منطق، فلسفہ اور علم الکلام میں وسعت نظر پیدا کی۔ اودھ میں شیعت کو عروج حاصل ہوا۔ رفتہ رفتہ سیکڑوں امام باڑے درجنوں کربلائیں اور آئمہ کرام کے بہت سے روضوں کی نقلی عمارتیں تعمیر کرائی گئیں۔ آبادی کا بڑا حصہ کسی نہ کسی پہلو سے محرم کی رسومات میں شامل ہوتا گیا۔ بہت ساری دولت اہل بیت کی عقیدت کی مد میں خرچ کی جاتی رہی جس نے لکھنؤ کے عوام کی طرز معاشرت پر گہرا اثر ڈالا۔

لکھنؤ کی تہذیبی انفرادیت کی ایک اہم خصوصیت یہاں پر بڑھا ہوا احساس نفاست، شائستگی، نزاکت طبع اور شعور اخلاق تھا۔ اس کے محرکات اودھ کی جغرافیائی خصوصیات کے ساتھ ساتھ شاہی خاندان کی نسلی ایرانی شائستگی، لکھنؤ کی ریاست کے فوجی امن اور بیرونی دشمنوں کا خاتمہ تھے۔ عوام کی نظر میں کوئی بلند مقصد حیات نہ تھا، ریاست میں اندرونی سرکشی ختم ہو چکی تھی، انگریزی سیاسی قوت کے زیر اثر حکمرانوں نے اپنی تقدیر پر شاکر رہنا سیکھ لیا تھا۔ سو انھوں نے اپنے فطری رجحانات کی تکمیل کرنا اور تہذیب کے خدوخال کو سنوارنا بہتر سمجھا اور اپنی سیاسی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے ثقافتی ترقی کی طرف توجہ مبذول کر لی۔ لکھنؤ میں لباس، طعام، عادات و اطوار، آداب محفل، معیار شرافت، طرز تکلم، فنون لطیفہ اور زبان و بیان کے اندر ایک نفاست پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹر صفدر علی لکھتے ہیں:

> ”لکھنؤ کی ریاست ایسے وقت میں معرض وجود میں آئی جب ملکی فتوحات ختم ہو گئی تھیں۔ بیرونی دشمن باقی نہیں رہے تھے۔ کوئی بلند مقصد حیات قوم کے سامنے نہیں تھا۔ انگریز کی سیاسی قوت کے سائے میں اپنی تقدیر پر شاکر رہنا اپنے فطری رجحانات کی تکمیل کرنا اور اپنی تہذیب کے خدو خال سنوارنا زیادہ سے زیادہ یہی مقاصد ان فرماں رواؤں کے سامنے باقی رہ گئے تھے۔ اب یہاں کے لباس، طعام، عادات و اطوار، ضابطہ اخلاق، آداب محفل، معیار شرافت، طرز تکلم، فنون لطیفہ، زبان و بیان کے اندر حتٰی کہ ضمیر و خمیر تک میں ایک نیا سایہ، ایک نئی روشنی اور ایک نئی نفاست پیدا ہوئی، لہجہ سامع نواز تھا، تکلم میں دل کشی تھی، ذہن میں جودت اور طبعیت میں شگفتگی تھی۔ مزاج میں مروت، نرمی اور شائستگی نمایاں تھی۔ تیز چلنے کو شرفا آداب کے خلاف سمجھتے تھے۔ وضع کی پابندی ان کا دستور تھا۔ کسی کے ساتھ کچھ اچھا سلوک کر کے اس سے آنکھیں نہیں ملاتے تھے یعنی امداد و وظائف دیتے وقت اپنی نظریں نیچی رکھتے تھے مختصر یہ کہ

لکھنو نے تہذیب، مذہب، علم اور ادب سب کا ایک نیا معیار قائم کیا۔''(۳۲)

لیکن اس ساری بظاہر خوش کن صورت حال کے باوجود تمدنی ترقی کے ساتھ لکھنوی سماج میں فکری ترقی معکوس رخ میں ہونے لگی۔فکری ارتقاء، جو کسی کلچر کے سارے نظام کو کمزور ہونے اور اس کی قوت محرکہ کو زائل ہونے سے بچاتا ہے، رک گیا تھا۔جس کی بنا پر ثقافتی سطح پر لکھنؤ کے معاشرے میں کچھ کمزوریاں بھی ظاہر ہونے لگیں۔ان میں سب سے نمایاں کمزوری اس معاشرے کا فکری زوال تھا۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''اس ذہنی عمل کی انتہائی شکل دیکھنی ہے تو لکھنؤ کے اس معاشرے میں چلئے جو شاہان اودھ کے زیر اقتدار پروان چڑھا تھا۔اس معاشرے میں خیال کا ارتقاء رک گیا۔لذت پرستی اور تماشے بازی نئی نئی شکلوں میں ظاہر ہورہی تھی اور سارا کلچر اس نقطے پر سمٹ آیا تھا۔سستی جذباتیت پرستی، غیر سنجیدگی، پھکڑ پن اور ابتذال نے ساری دوسری اقدار کو پس پشت ڈال کر خود مرکزی حیثیت اختیار کر لی تھی۔اس کی انتہا یہ دیکھیے کہ شجاع الدولہ کے زمانے میں بازاری عورتوں اور ناچنے والے طائفوں کی

شہر میں اس قدر کثرت ہوگئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ ان سے خالی نہ تھا۔نصیر الدین حیدر میں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہوگئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا لباس پہنتے۔خیال کے ارتقاء کے رک جانے کے عمل کو آپ اس زمانے کی شاعری میں بھی دیکھ لیجئے، ہر سطح پر یہ عمل منفی اقدار کی پیدائش کا موجب بن رہا تھا۔''(۳۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے جس شاعری کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی اہم مثال ریختی ہے۔ریختی، جو لکھنوی ادب کا بنیادی عنصر ہے، اردو شاعری کی ایسی صنف ہے جس کی مثال عالمی ادب میں ملنا مشکل ہے۔یہ صنف ادب اپنی طرز کی واحد مثال ہے جو لکھنؤ میں ہی شروع ہوئی اور وہیں پر کمال کو پہنچی۔اس میں عورتوں کی زبان اور محاورے میں نسائی احساسات وجذبات کو شاعرانہ جمالیات کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا۔شاعری اور ادب کے ساتھ لکھنؤ میں اردو زبان میں بھی ترقی جاری رہی۔مرزا مظہر کی کوششوں سے اردو میں عربی فارسی الفاظ کے اصل املا کے مطابق لکھا جانا شروع ہوا۔اس تحریک کا اثر لکھنؤ میں زبان کی ترقی پر پڑا۔محی الدین قادری زورؔ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے۔

''دہلی میں ابھی یہ لسانی تبدیلیاں شروع ہوئی تھیں کہ اس پر تباہی کے بادل امڈ امڈ کر آنے لگے آخر کار دہلی اجڑ گئی اور لکھنؤ آباد ہوگیا۔لکھنؤ میں پہلے دہلی ہی کی زبان کی تقلید کی گئی کیونکہ بڑے بڑے شاعر اور ارباب علم وفضل دہلی ہی سے آئے تھے،لیکن عہد آصف الدولہ کے بعد خود وہاں بڑے بڑے شاعر اور انشاء پرداز پیدا ہونے لگے تو اہل لکھنؤ نے جیسے سیاسی حیثیت سے خود مختاری کا اعلان کیا،زبان میں بھی دہلی کی غلامی سے آزاد کر لیا اور جیسے جیسے لکھنؤ کی تالیف و تصنیف میں اضافہ ہوتا گیا وہ ایک جداگانہ دبستان بنتا گیا۔وہاں کے الفاظ، محاورے اور روز مرے جو پہلے غلط سمجھے جاتے تھے،اب مستند ہوگئے۔''(۳۴)

بیسویں صدی کے شروع میں لکھنوی سماج کا رنگ آہستہ آہستہ بدل رہا تھا۔ جاگیرداری اور کاشتکاری کی بجائے معاشرہ دھیرے دھیرے صنعتی اور تجارتی رنگ اختیار کرتا جا رہا تھا۔قدیم نوابین اور ان سے وابستہ مصاحب نہ صرف بے مصرف ہوتے جا رہے تھے بلکہ ان کی سرگرمیاں روز بروز کمزور ہوتی ہوئی معیشت وتہذیبی رکھ رکھاؤ کو اور کمزور کر رہی تھیں۔گویا وہ ادارے جو لکھنوی تہذیب کی بنیاد تھے ،دم توڑ رہے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ ان اداروں کی تشکیل کردہ تہذیب اور سماج بھی اپنا رنگ بدلنے لگا تھا۔ دربار اور جاگیرداری کا ادارہ ختم ہوا تو اس سے وابستہ لکھنوی تہذیب بھی کمزور پڑنے لگی۔شاہی دور میں لکھنؤ نے ہر قسم کے فنون اور معاشرتی رسم رواج میں باقی ہندوستان سے الگ اور منفرد اسلوب اپنایا اور اپنی اس انفرادیت کی بنیاد پر لکھنؤ ہند اسلامی گنگا جمنی تہذیب کا گہوارا بنا جسے شرر نے مشرقی تمدن کا آخری نمونہ کہا۔پاک وہند میں آج تک لکھنؤ کی تاریخ وتہذیب اور ادب پر لکھی گئی سینکڑوں کتابیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس کے سقوط کے کم وبیش ایک سو ساٹھ سال بعد بھی لوگ بلا تفریق مذہب ہندو اور مسلم لکھنؤ کی تہذیب وثقافت اور وہاں کی شاہی کے خاتمے پر ماتم کناں ہیں۔

مندرجہ بالا تاریخی اور سیاسی حالات کی روشنی میں اہل لکھنؤ کی نسائی حسیّت، ذوق داستان سرائی اور نفاست و ملائمت کی فکری بنیادیں تلاش کی جا سکتی ہیں۔آریاؤں کے آمد کے بعد یہ خطہ ہندو مذہب کا مرکز بنا۔ہندو مذہب کی روایت کے مطابق کرشن مہاراج ہی پوری دنیا میں اکیلا مرد ہے جب کہ باقی ساری مخلوق اس کی گوپیاں یعنی عورتیں ہیں۔اس لیے اس خطے کے مزاج میں نسائیت رچ بس گئی ہے۔اس خطے ہی میں ۵۶۳ ق م میں گوتم بدھ پیدا ہوا جس نے موجودہ بہار کے ایک شہر 'گیا' میں جنگلی انجیر کے درخت کے نیچے گیان حاصل کیا۔اس طرح یہ خطہ بدھ تعلیمات کا مرکز بن گیا۔ بدھ مذہب میں جاتک کہانیاں مذہبی متن کا درجہ رکھتی ہیں۔کہانی کہنے اور سننے کی یہ بدھ کی مذہبی روایت وقت کے ساتھ اس خطے کے لوگوں کے مزاج میں بس گئی اور داستان سرائی کا ذوق پروان چڑھا۔ تیسری اہم بات اس خطے کا موسم، جغرافیائی اور زرخیز زمینوں کی وجہ سے دولت کی فراوانی نے یہاں کے لوگوں کے مزاج میں نفاست اور زبان میں لوچ پیدا کر دیا۔مزید یہ کہ شاہان اودھ کی علم نوازی اور انفرادیت پسندی نے لکھنؤ کی تہذیب کو منفرد رنگ دے کر اس برصغیر کی تاریخ میں الگ شناخت عطا کی۔

حواشی وحوالہ جات:

(۱) ڈیورانٹ، ول، مترجم تنویر جہاں، ۲۰۰۴ء، **انسانی تہذیب کا ارتقاء**، فکشن ہاؤس، لاہور، باب دوم، ص: ۱۱ تا ۲۸

(۲) ایضاً: باب دوم، ص: ۱۱ تا ۲۸

(۳) عبدالباری، ڈاکٹر سید، ۱۹۸۷ء، **نکھنؤ کے شعر ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر**، سلطان پور، اتر پردیش، ص: ۱۹

(4) Richard T. Schaefer, 2005, 'Sociology' 9th Ed; MCGraw Hill USA, Ch6,

p56-78.

(۵) جالبی، ڈاکٹر جمیل، ۱۹۹۷ء، **پاکستانی کلچر**، نواں ایڈیشن، نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی: باب دوم، ص: ۳۹ تا ۵۹

(۶) شمس، محمد باقر، سن ندارد، **نکھنو کی تہذیب**، باب الاسلام پریس، کراچی، ص: ۸

(۷) شمس، محمد باقر، ۱۹۷۱ء، **تاریخ نکھنو**، دارالتصنیف، کراچی، حصہ اول، ص: ۱۸

(۸) چوہان، ٹھاکر رام داس، ۲۰۰۷ء، **مہا بھارت**، لاہور: ص ۹

(۹) رام پوری، نجم الغنی، ۱۹۷۸ء، **تاریخ اودھ**، نفیس اکیڈمی، کراچی، جلد اول، ص: ۳۳

(۱۰) ایضاً، ص: ۱۲

(11) Opening at the Kosala capital of King Dasharatha, Ayodhya, from which the region of present day Uttar Pardesh derived its earlier name,Oudh,the RAMAYANA gives us many insights into the later Aryan court life.",Stanley Wolpert,2007, *A New History of India*, 7th Ed; Oxford University Press,London. pp37.

(12) Wolpert,Stanley,2007, *A New History of India*, 7th Ed; Oxford University Press, London. pp 46.

(۱۳) ایضاً، ص: ۲۴

(۱۴) شرر، عبدالحلیم، **گذشتہ نکھنو**، مرتبہ، محمد اکرم چغتائی، ۲۰۰۶ء، سنگ میل، لاہور، ص: ۲۵

(۱۵) قیوم نظر، ۱۹۶۴ء، ''لکھنؤ کا معاشرتی ابتدائیہ''۔ فیض آباد، مشمولہ **صحیفہ**، اپریل ۱۹۶۴ء، مدیر، عابد علی عابد، لاہور، ص: ۵۲

(16) Mohan,Surendara,1997, *Awadh Under The Nawabs*, MANOHAR, New Delhi. p26.

(17) Oldenburg, Veena Talwar, 2001, *A Fatal Friendship*, The Lucknow Omnibus 3ed Ed, Oxford University Press, piii

(18) Mohan,Surendara,1997, *Awadh Under The Nawabs*, MANOHAR, New Delhi. pp11.

(۱۹) شاہ، باقر علی، سن اشاعت ندارد، **شاعری کا دبستان دلی و نکھنو**، غیر حقیقی تقسیم''، اظہار سنز، لاہور، ص: ۱۲

(۲۰) خان، امجد علی، ۱۹۷۸ء، **تاریخ اودھ کا مختصر جائزہ**، واجد علی شاہ اکیڈمی، لکھنؤ، ص: ۱۴۴

(۲۱) اظہر برلاس، مرزا علی، ۱۹۸۴ء، **اودھ پر انگریز کا غاصبانہ قبضہ**، اودھا کیڈمی سندھ، کراچی، ص: ۱۴۰

(۲۲) اظہر برلاس، مرزا علی، ۱۹۸۴ء، ص: ۱۶۶

(۲۳) رام پوری، نجم الغنی، ۱۹۸۳ء، جلد پنجم، ص: ۴

(24) Yamane, So, 2000, *Lamentation Dedicated to the declining Capital*: Urdu